سفرنامہ

سفرنامہ ہمارے زمانے کی ایک مقبول صنف ہے۔ ہر سفر ایک تجربہ ہوتا ہے اور اگر کسی شخص میں اس تجربے کو بیان کرنے کی صلاحیت بھی ہوتو ایک دل چسپ سفرنامہ لکھا جاسکتا ہے۔ پرانے زمانے میں جب مسافر سفر سے واپس آتے تو اپنے تجربات کی روداد دوستوں اور عزیزوں کو سناتے تھے۔اس طرح کے بہت سے قصّے آپ نے بھی پڑھے ہوں گے۔ اردو نثر کی ترقی کے ساتھ ہمارے ادبی سرمائے میں کئی صنفوں کا اضافہ ہوا۔سوانح نگاری، خودنوشت، تنقید، انشائیہ اور سفرنامہ، نثر کی نسبتاً جدید تر صنفیں کہی جاتی ہیں۔

سفرنامے کے مطالعے سے ہمیں اجنبی دیاروں، دوردراز کے ملکوں، تہذیبوں اور جغرافیائی حالات سے آگاہی ملتی ہے۔ بہت سے انوکھے کرداروں سے ملاقات ہوجاتی ہے۔ سفرنامے ہمارے لیے اس دنیا کے مختلف علاقوں سے تعارف کا ذریعہ بنتے ہیں۔ سفرناموں کے مطالعے سے ہماری عام معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ ہم گھر بیٹھے بڑی بڑی مہمیں سر کرلیتے ہیں اور ایسے دیاروں تک جا پہنچتے ہیں جہاں جانا ہمارے لیے آسان نہ ہوتا۔ اس لحاظ سے سفرنامے کو عملاً سفر کا بدل بھی کہا جاسکتا ہے۔

اردو کا پہلا سفرنامہ یوسف خاں کمبل پوش کا ''عجائبات فرنگ'' ہے۔ یوسف خاں نے 30 مارچ 1837 میں کلکتہ سے پانی کے جہاز کے ذریعے انگلستان کا سفر کیا تھا۔ انھوں نے انگلستان کے شہر لندن میں قیام کیا۔ وہاں کی آب وہوا، نئی نئی ایجادات اور وہاں کے باشندوں کا ذکر انھوں نے نہایت دل چسپ انداز میں کیا ہے۔

سرسید احمد خاں کے سفرنامے ''مسافرانِ لندن'' کو بہت شہرت حاصل ہوئی۔

سرسید کے معروف معاصرین میں محمد حسین آزاد کا سفرنامہ ''سیرِ ایران'' اور مولانا شبلی نعمانی کے ''سفرنامۂ روم ومصروشام'' بھی اہم سفرنامے ہیں۔

بیسویں صدی کے سفرناموں میں منشی محبوب عالم کے دو سفرنامے ''سفرنامہ یوروپ'' اور ''سفرنامۂ بغداد''، قاضی عبدالغفار کا سفرنامہ ''نقشِ فرنگ'' بہت مقبول ہوئے۔

خواجہ احمد عباس کا ''مسافر کی ڈائری'' پروفیسر احتشام حسین کا ''ساحل اور سمندر'' قرۃ العین حیدر کا ''جہانِ دیگر'' اور ''شاہراہِ حریر'' اردو کے دل چسپ سفرنامے ہیں۔ مشہور سفرنامہ نگاروں میں بیگم اختر ریاض، مستنصر حسین تارڑ کے نام بھی شامل ہیں۔ اردو میں چند مزاحیہ سفرنامے بھی لکھے گئے ہیں جن میں ابن انشا، شفیق الرحمٰن اور مجتبیٰ حسین کے سفرنامے قابلِ ذکر ہیں۔

© NCERT not to be republished

رام لعل

1923 تا 1996

رام لعل اردو کے مقبول افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانوں کے تقریباً بارہ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے تین ناول بھی لکھے ہیں۔ وہ مغربی پنجاب کے شہر میانوالی میں پیدا ہوئے۔ لاہور میں تعلیم حاصل کی اور وہیں ریلوے میں ملازم ہو گئے۔ تقسیم کے بعد رام لعل ہندوستان آ گئے اور یہاں بھی ریلوے میں ملازمت کر لی۔

رام لعل نے دو سفرنامے ''خواب خواب سفر'' اور ''زرد پتّوں کی بہار'' بھی لکھے۔ پہلا یورپ کے سفر کی روداد ہے اور دوسرے میں پاکستان کے سفر کی تفصیلات ہیں۔

رام لعل کا دوسرا سفرنامہ اس اعتبار سے بہت انوکھا ہے کہ یہ سفر مصنّف نے نئی دنیا کی دریافت کے لیے نہیں کیا بلکہ اپنی پرانی یادوں کو تازہ کرنے کے لیے کیا تھا۔ اس لیے اس سفرنامے میں ماضی اور حال ایک دوسرے سے گلے ملتے نظر آتے ہیں۔ وہ جب کسی جگہ کسی عمارت کو دیکھتے ہیں یا کسی شخص سے ملتے ہیں تو اس کے حوالے سے انھیں اپنے لاہور کے دنوں کی یاد آنے لگتی ہے۔

رام لعل کو سفرنامہ نگار کی حیثیت سے اپنے مشاہدات اور تجربات کو مناسب الفاظ میں پیش کرنے کا فن آتا ہے۔ اس سفرنامے میں ان کی نثر بہت سادہ اور رواں ہے۔

© NCERT not to be republished

5257CH15

زرد پتّوں کی بہار

میں جب واہگہ کے راستے آٹھ فروری 1980 کو ریل کے ذریعے لاہور کی طرف بڑھ رہا تھا تو میرے دل میں کئی طرح کے وسوسے تھے۔ میں وہاں کیوں جا رہا ہوں؟ وہاں تو اب میرا کوئی سگا سمبندھی بھی نہیں رہتا۔ پاکستان سرکار نے 1978 میں ایک بار میری ویزا کی درخواست مسترد کر دی تھی۔ اب دوسری بار درخواست دینے پر اچانک منیر احمد شیخ نے جو ہندوستان میں پاکستانی سفارت خانے میں پریس کونسلر ہیں، مجھے یہ کہہ کر ویزا دلوا دیا کہ موجودہ حکومتِ پاکستان دونوں طرف کے عوام میں محبت اور دوستی کے جذبات کو بڑھانا چاہتی ہے۔ اب میں اپنے قلم کے رشتے داروں سے ہی ملنے کے لیے وہاں جا رہا ہوں، جن میں سے بیشتر کی کتابیں مجھے ملتی رہی ہیں۔ جن کے رسالوں میں میں چھپتا رہا ہوں اور جن کے خدوخال، میں ان کی تخلیقات سے پہچانتا ہوں۔ ان میں سے کئی ایک نے اکثر مجھے اپنے یہاں آنے کی دعوت دی ہے۔

میں میانوالی میں پیدا ہوا تھا، جہاں میرے آباواجداد صدیوں پہلے راجستھان کے ریتیلے میدانوں میں گھوڑوں پر عرب حملہ آوروں کے آگے آگے بھاگتے ہوئے وہیں جا کر پناہ گزیں ہوئے تھے۔ اس سے بھی بہت پہلے وہ کشمیر اور وزیرستان کے کسی

© NCERT not to be republished

درمیانی علاقے کی سلطنت اجڑ جانے پر جنوب کی طرف ایک قافلے کے ساتھ راجستھان کی طرف نکل گئے تھے۔ نقل مکانی مجھے وراثت میں ہی ملی ہے۔ اب میں عارضی طور پر اس جگہ کی طرف لوٹ رہا ہوں جہاں میرے کئی بزرگوں اور عزیزوں نے آخری سانسیں لی تھیں۔ جس مکان میں میری ماں نے جان دی تھی اور جس کی شکل بھی مجھے یاد نہیں ہے۔ کیونکہ تب میں صرف دو اڑھائی سال کا تھا۔ اسی مکان میں اسے پھر سے تلاش کروں گا۔ میں بھی اسی مکان میں پیدا ہوا تھا۔ لاہور میں جوان ہوا تھا۔ اور وہاں سے میں جوان ہی ہو کر آیا تھا۔ اب چھپن برس کی عمر میں وہاں لوٹ رہا ہوں۔ میرے بچپن اور بڑھاپے کے درمیان عمر کا یہ فاصلہ کس قدر طویل ہو گیا تھا، جو اَب ریل کی رفتار کے ساتھ لمحہ بہ لمحہ سمٹتا جا رہا ہے، کم ہوتا جاتا ہے، اسی فاصلے کو میں بے شمار بار خوابوں کی مدد سے آناً فاناً لانگھ گیا۔ خوابوں کے سامنے سرحدیں اور فاصلے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ میں اپنے ماضی کے ساتھ اس لیے ابھی تک جڑا رہا ہوں کہ وہ میرے خوابوں میں اپنی اصلی حالت میں ابھی تک موجود رہا ہے۔ میں نے اتنا عرصہ خوابوں کے ساتھ جینا سیکھا ہے۔ میں نے اپنے ماضی کو بھلانے کی کبھی کوشش کی تو یہ اچانک میری کسی نہ کسی کہانی میں گھس کر بیٹھ گیا۔ ماضی انسان کی پہچان بن جاتا ہے۔ یہ نہ ہو تو وہ بالکل اجنبی بن جائے۔ کسی دوسری ہی دنیا کا انسان جس کے پاؤں زمین کے ساتھ نہیں لگے ہوں گے۔ ماضی ہماری زمین ہے اور زمین ہی کے ساتھ ہم نے ہمیشہ گہرا رشتہ قائم رکھا ہے۔

میں اچانک ماضی کی بھول بھلیّوں میں سے نکل کر لاہور کے مضافات میں پھیلے ہوئے کھیتوں، اینٹوں کے بھٹّوں، چھوٹے چھوٹے قصباتی مکانوں اور چھوٹی چھوٹی مسجدوں کے میناروں کے درمیان پہنچ جاتا ہوں۔ میں محسوس کرنے لگتا ہوں میرے نتھنوں میں جو تازہ ہوا آ رہی ہے وہ میری جانی پہچانی سی ہے۔ میں اس کی خوش بو سونگھ کر بتا سکتا ہوں کہ یہ میرے لاہور سے آ رہی ہے۔ پنجاب کے اس حصے سے آ رہی ہے جسے میں کبھی بھلا نہیں پایا۔ میں ریلوے ٹرین کی کھڑکی میں سے بڑی خاموشی سے تیزی سے گزرتے ہوئے واچ ٹاوروں اور اونچی اونچی اُگی ہوئی گھاس پھوس اور مٹی میں چھپے ہوئے پل باکسوں کی طرف دیکھتا ہوں جہاں سے سن پینسٹھ میں بڑی کامیابی سے ہندوستانی یلغار سے دفاع کیا گیا تھا۔ اب تو یہاں کچھ بھی نہیں ہے۔ صرف ہوا ہے اور دھوپ ہے اور خوشبو ہے اور کھیتوں میں ہر طرف اُگے ہوئے سنہری گندم کے لہلہاتے ہوئے خوشے ہیں اور ریل کی پٹری کے متوازی دوڑتی ہوئی ایک سڑک ہے جس پر دو جاپانی کاریں آگے پیچھے دوڑ رہی ہیں اور ایک ٹوبھّے (جوہڑ) کے سامنے کئی بھینسیں بیٹھی ہوئی ہیں جن کی طرف ذرا فاصلے پر ایک چھکڑے کے پہیّے کے ساتھ بندھا ہوا ایک اونٹ فلاسفروں کی سی گمبھیرتا سے ایک ٹک دیکھ رہا ہے اور ایک پیڑ کے نیچے ایک گبرو لیٹے لیٹے بانسری بجا رہا ہے اور ایک مکان کے آنگن کی دیوار پر کوئی دوشیزہ دھوپ میں سوکھتے ہوئے رنگین کھیس کو الٹ پلٹ کر دیکھتے دیکھتے اچانک گاڑی کی طرف متوجہ ہو گئی ہے۔

© NCERT not to be republished

پھر میری نظروں کے سامنے مغل پورہ ورکشاپ کے شیڈوں کے چمکتے ہوئے ٹین ابھر آتے ہیں۔ یہیں کہیں میں پانچ سال تک بطور اپرنٹس خراد مشین کا کام سیکھتا رہا تھا۔ ریل کا شور اچانک بڑھ گیا ہے۔ اب گاڑی یارڈ میں داخل ہوگئی ہے۔ دونوں طرف مال گاڑیوں کا سلسلہ ہے جس میں سے نکلتے ہی اچانک مجھے لاہور کا سائن بورڈ دکھائی دے جاتا ہے، اور گاڑی پلیٹ فارم پر پہنچ کر رک جاتی ہے اس ڈبے میں میرا ہم سفر علی عباس حسینی مرحوم کا ایک رشتے دار ہے جسے کراچی جانا ہے۔ وہ اور میں دونوں کتنی دیر سے خاموش ہیں۔ وہ مجھے بڑی خاموشی سے بیٹھا ہوا دیکھتا ہے تو کہہ اٹھتا ہے۔

''رام لعل صاحب، قلی کو بلایا جائے؟''

میں اسے کوئی جواب دیے بغیر پلیٹ فارم پر اتر جاتا ہوں۔ پلیٹ فارم پر چل کر محسوس کر رہا ہوں، میں واقعی زمین پر ہوں۔ یہ خواب نہیں ہے۔ جو خواب تھا وہ اب پورا ہو چکا ہے۔ قلی سامان اٹھا کر آگے آگے بھاگ رہے ہیں۔ گاڑی کے ہر ڈبے سے سیکڑوں لوگ اُبل سے پڑے ہیں۔ بمبئی، حیدرآباد، مدھیہ پردیش اور بہار اور یوپی کے لوگ مرد اور عورتیں اور بچے۔ سفر کی گرد سے اٹے ہوئے اور پریشان اور حواس باختہ کچھ عورتیں جلدی جلدی اپنے برقعے پہن رہی ہیں۔ ایک لڑکے کے ہاتھ میں کرکٹ کا بلا ہے۔ ایک لڑکی اپنے بیگ میں جلدی جلدی فلم فیر ٹھونس رہی ہے۔ اسے وہ کسٹم والوں کی نظر سے بچا کر اپنی ہندوستانی فلموں کی شوقین فرینڈز تک لے جانا چاہتی ہے۔ جہاں قلی نے لے جا کر میرا سامان ایک طرف رکھ دیا تھا وہاں پاسپورٹ چیک کرانے والوں کی بھیڑ دیکھ کر میں گھبرا جاتا ہوں۔ یہاں تو کئی گھنٹے اپنی باری آنے میں لگ جائیں گے۔ کسٹم کے پاکستانی عملے کی طرف میں بڑی خاموشی سے دیکھتا ہوں۔ یہ سب لوگ خوبصورت اور اسمارٹ ہیں سب پنجابی ہی بولتے ہیں۔ قلی بھی پنجابی بولتے ہیں۔ لال لال وردیوں کے نیچے نیشنل ڈریس بھی پہنے ہوئے ہیں۔ یک رنگی شلوار اور قمیص، شکل وصورت سے قلی نہیں لگتے۔ میں خود کو پنجابی بولنے کے لیے آمادہ کر کے ایک آدمی کو روک کر پوچھتا ہوں۔

''اِتھے ریسیو کرن آن والے لوگ تاں باہری کھڑے رہندے نیں؟''

بھیڑ میں اچانک میرے سامنے ڈاکٹر احراز نقوی کا چہرہ ابھر آتا ہے، وہ جلدی سے میرے ہاتھ سے پاسپورٹ اور ویزا لے کر کسٹم والوں کی طرف چل دیتا ہے۔ وہ بھی دوسرے مسافروں کی طرح گھبرایا ہوا ہے۔ اس کی گھبراہٹ پر میں مسکرا دیتا ہوں اور پھر میرے سامنے تین اور مسکراتے ہوئے چہرے آجاتے ہیں۔ ڈاکٹر آغا سہیل، طاہر تونسوی اور ابصار عبدالعلی، احراز کی طرح آغا سہیل اور ابصار بھی لکھنؤ کے ہیں۔ ان تینوں کو میں ان کے بچپن سے جانتا ہوں۔ وہ ہماری ادبی محفلوں میں ہی جوان ہوئے ہیں اور اب لاہور کی محفلوں میں جگمگا رہے ہیں۔ طاہر تونسوی پچھلے سال ڈاکٹر مسعود حسن رضوی ادیب مرحوم پر ریسرچ کرنے کے لیے

لکھنؤ آیا تھا اور دو مہینے وہاں رہا تھا۔ان کے ساتھ بشیر بھی تھے۔ طاہر رضا زیدی کا ڈرائیور۔ وہ سب میرے سامان کا ایک ایک تگ اٹھا کر بھیڑ میں گھستے چلے جاتے ہیں۔ ایک پوسٹ سے دوسری پوسٹ پر۔وہ وہاں کسی نہ کسی کو ضرور جانتے ہیں۔ ان سے مجھے بھی متعارف کراتے جاتے ہیں۔ رام لعل کا افسانہ نگار ہونا جیسے کوئی اہم بات ہو! سب لوگ ہاتھ ملا کر مسکراتے ہیں اور مجھے آگے بڑھ جانے کے لیے کہتے ہیں۔ اچانک ایک ٹکٹ کلکٹر مجھ سے ٹکٹ طلب کرتا ہے۔ امرتسر سے لاہور تک کا اور میں اچانک یاد کر کے بتاتا ہوں ٹکٹ تو میں نے لیا ہی نہیں تھا۔ میں تو ریلوے کا ملازم ہوں۔ آپ ہی کی طرح''

وہ مسکرا کر مجھے جانے دیتے ہیں۔

''اب تم لاہور میں ہو! اپنے لاہور میں!'' آغا سہیل مسکرا رہا ہے۔

''میں نے یہاں سے آخری بار تنخواہ لی تھی۔ چھ اگست 1947 کو۔'' میں اسی پلیٹ فارم پر بنے ہوئے کیش آفس کی طرف اشارہ کر کے بتاتا ہوں۔

''اور میں اسی پلیٹ فارم سے کالکا میل سے جالندھر کے لیے روانہ ہوا تھا۔''

لاہور اسٹیشن کے باہر دو کاریں موجود تھیں۔ ایک تو ابصار عبدالعلی کی تھی۔ دوسری طاہر رضا زیدی نے بھجوائی تھی۔ وہیں پر کراچی سے آئے ہوئے راحت سعید اور 'واہ سیمنٹ فیکٹری' کے محمد حسن عسکری بھی موجود تھے۔ ان دونوں سے میرا پہلی بار تعارف ہوا۔ راحت سعید، پی آئی اے میں ٹیکنیکل منیجر ہیں اور اکثر مختلف ملکوں میں گھومتے رہتے ہیں۔ وہ میری خاطر رک گئے تھے اور اسی شام کو کراچی جانے کا پروگرام بنا چکے تھے۔ ایک شام پہلے اردو کے منفرد نقاد محمد علی صدیقی کو ایک بہت ضروری کام سے واپس کراچی جانا پڑ گیا تھا لیکن وہ معذرت کے ساتھ ساتھ یہ بھی پیغام چھوڑ گئے تھے کہ اب وہ میرا استقبال کراچی میں ہی کریں گے۔

اچانک آغا سہیل نے مجھ سے پوچھا۔

''لاہور کو کچھ بدلا ہوا پایا.....؟''

میں نے سر گھما کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں جو بلاشبہ ایک ذہین کہانی کار کی آنکھیں تھیں، مجھ پر ٹکی ہوئی تھیں اور میری حیرت سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ وہ بھی تو لکھنؤ کی گلیوں سے کٹ چکا تھا۔ چند ماہ پہلے آیا تھا تو وہ بھی تو وہاں اپنے کھوئے نشان تلاش کرتا پھرا تھا۔ کہاں بیٹھ کر وہ دوستوں کے ساتھ چائے پیا کرتا تھا۔ کس جگہ اس نے جمال پاشا کے ساتھ ایک خاص ایکٹی وٹی کی تھی اور یونیورسٹی جانے کے لیے وہ کون کون سی گلیوں سے ہو کر نکلتا تھا۔ تب وہ لکھنؤ آزادی سے پہلے کا تھا اور اپنی ساری روایات اور پورے آب و تاب کے ساتھ موجود تھا۔ میں نے کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے جواب دیا:

''بہت کچھ تو وہی ہے۔ بہت کچھ نیا نیا سا بھی ہے۔''

آغا سہیل کی رہایش گاہ واقع ایف سی کالج میں دونوں گاڑیاں ساتھ ساتھ پہنچیں۔ اُن کے بیٹے محسن سے پہلی بار ملاقات ہوئی باپ سے کچھ زیادہ ہی اونچا اور صحت مند نظر آیا۔ اس نے آگے بڑھ کر سلام کیا۔ ہاتھ ملایا اور میرا سامان بشیر کی مدد سے اتروا کر اندر لے گیا۔ ہم سب ایک کھلے کھلے اور خوبصورتی سے سجے ہوئے ڈرائنگ روم میں جا بیٹھے، ابصار عبدالعلی ، طاہر تونسوی، احراز نقوی، محمد حسن عسکری اور راحت سعید، آغا سہیل اندر چائے کا انتظام کرنے چلا گیا تھا۔ پھر اس کی آواز بھی سنائی دی وہ فون کر رہا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ آیئے آپ کو اپنے ایک دیرینہ رفیق سے ملاؤں.....

اُس طرف احمد ندیم قاسمی تھے۔ جمعہ کی وجہ سے گھر پر تھے۔ ایک مدت کے بعد (1942 کے بعد) میں نے ان کی آواز سنی۔ اتنے قریب سے ۔ اس شہر میں مجھے سب سے پرانے جاننے والوں میں ایک وہ تھے، دوسرے میرزا ادیب۔ میرزا ادیب صاحب سے بھی پہلی ملاقات دہلی میں 1961 میں پہلی ہندو پاک ثقافتی کانفرنس میں ہوئی تھی۔ قاسمی صاحب نے پوچھا:

''کب آئے؟''

میں نے بتایا ''بس ابھی آ کر بیٹھا ہوں۔''

''خوش آمدید۔ سب خیریت ہے نا۔ کب ملو گے؟''

''جی شکریہ۔ جس وقت آغا سہیل لے کر آئیں گے، حاضر ہو جاؤں گا۔''

''اچھا کیا پروگرام ہے؟''

''میں آج ہی رات کو ملتان چلا جاؤں گا۔ وہاں کل میرے ایک دوست کی شادی کا ولیمہ ہے۔''

کچھ باتیں اور بھی ہوئیں۔ پھر میں جلدی جلدی گرم پانی سے نہا کر اور کپڑے بدل کر ڈرائنگ روم میں آ بیٹھا سہیل صاحب کی بیگم اور ان کے بچوں سے بھی ملاقات ہوئی۔ بہت سے پروگرام طے ہونے لگے لیکن کوئی پروگرام نہ بن سکا۔ آخر فیصلہ یہی ہوا کہ میں آج رات سے پہلے کہیں نہیں جاؤں گا۔ اور ملتان سے لوٹ کر ہی سب سے ملوں گا۔ سب لوگ چائے پی کر اور رخصت لے کر چلے گئے۔

(رام لعل)

© NCERT not to be republished

مشق

لفظ و معنی

خدشہ	:	خطرہ، ڈر، خوف، اندیشہ
غمّاز	:	اشارہ کرنے والا، چغل خور
مضافات	:	مضاف کی جمع، اِردگرد، شہر کے آس پاس کے قصبے، گاؤں
یلغار	:	حملہ
دفاع	:	بچاؤ
عملہ	:	کسی محکمے کے ملازم، کام کرنے والے، کارکن

غور کرنے کی بات

- ملک کی تقسیم کے بعد ایک شخص جو اپنا وطن چھوڑ کر دوسری جگہ جا بستا ہے اسے دوبارہ اپنے وطن کی یاد کس طرح بے چین کرتی ہے اور اسے ایک بار پھر وہاں جانے کا موقع ملتا ہے تو اس کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔ اس کا اظہار اس سفر نامے میں بخوبی کیا گیا ہے۔ وطن سے محبت کا جذبہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔

سوالات

1. ایک اچھے سفر نامے میں ہم کیا کیا خوبیاں تلاش کرتے ہیں؟
2. رام لعل پاکستان کیوں جانا چاہتے تھے؟
3. لاہور پہنچ کر رام لعل کن معروف ادیبوں سے ملے؟
4. اپنے ماضی کے بارے میں رام لعل نے جو باتیں لکھی ہیں انھیں اپنے لفظوں میں لکھیے۔

عملی کام

- آپ نے اگر کسی ملک یا شہر کا سفر کیا ہے تو اسے سفر نامے کی صورت میں تحریر کیجیے۔

© NCERT not to be republished